برصغیر میں امام شاہ ولی اللہ اور ان کی جماعت کا سیاسی کردار

(تاریخی وارتقائی مطالعہ)

محمد انس حسان ☆

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کا دور سیاست کے حوالے سے برصغیر میں مسلمانوں کے انحطاط کا دور تھا۔ آپؒ کے عہد میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد گیارہ مغل بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ اس دور میں گیارہ بادشاہوں کا بدلنا برصغیر کے سیاسی عدم استحکام کا پتہ دیتا ہے۔ اس تیزی کے ساتھ اور اس نہج پر بادشاہوں کی تبدیلی سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ یہ سلطنتِ مغلیہ کی جانکنی کا عالم تھا۔ شاہ صاحبؒ جانتے تھے کہ مغلیہ سلطنت اب زیادہ عرصہ چل نہ سکے گی۔ اسی بناء پر انہوں نے اس کمزور ریاست کو بچانے کی بجائے مستقبل کی پیش بندی کو ترجیح دی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی فکر مرتب کی اور اس فکر کی بنیاد پر جماعت سازی کی۔ تاہم شاہ صاحبؒ کی جماعت کو المیہ یہ پیش آیا کہ انگریز سامراج کی ریشہ دوانیوں نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی اور یہ جماعت شاہ ولی اللہ کے افکار اور فلسفہ کے مطابق سماج کی تشکیل جدید اور اقتصادی توازن وخوشحالی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ کرسکی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی فکر کی حامل جماعت نے ہر دور میں اپنی مساعی جاری رکھیں۔ شاہ صاحبؒ کی سیاسی تحریک کو درج ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) پہلا دور امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء میں شروع کیا اور اس کا اختتام سیدین کی تحریک (معرکہ بالا کوٹ) یعنی ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء پر ہوا۔ یہ دور سو سالہ جدوجہد پر مبنی ہے۔

(ب) دوسرا دور امام شاہ اسحاق دہلویؒ نے ۱۲۴۷ھ/ ۱۸۳۱ء سے شروع کیا اور یہ دور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی گرفتاری یعنی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء پر ختم ہوگیا۔

(ج) تیسرے دور کا آغاز شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء سے کچھ عرصہ قبل شروع کیا۔

☆ محمد انس حسان، لکچرر اسلامیات، گورنمنٹ ڈگری کالج، جہانیاں۔

(الف) ولی اللّٰہی تحریک کا پہلا دور

اس دور میں تین امام ہوئے اور ایک امارت منعقد ہوئی جسے سیدین کی تحریک سے یاد کیا جاتا ہے۔

۱۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۱۱۴ھ/۱۷۰۳ء تا ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء)

۲۔ امام شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (۱۱۷۶ھ/۱۷۶۳ء تا ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)

۳۔ امام شاہ محمد اسحاق دہلویؒ (۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء تا ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۶ء)

ایک طرف جہاں شاہ صاحبؒ اپنی فکر مرتب کر رہے تھے تو دوسری طرف اس فکر کی عملی تشکیل سے بھی بے خبر نہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تقدیر بدلنے کے لیے اعلیٰ فکر و فلسفہ کے ساتھ ساتھ جماعت سازی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے اپنی فکر کی حامل جماعت تیار کی اور ان کی تیار کردہ اس جماعت نے ان کے فکر و فلسفہ کو آگے بڑھایا۔ شاہ صاحبؒ نے تصوف کے خاص طریقہ کی بیعت کو اپنے سیاسی نظام کی اساس بنایا۔ مولانا عبیداللہ سندھی (۱۸۷۲ء-۱۹۴۴ء) اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''طریقت کی بیعت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ بیعت کرنے والے نے جماعت کا سیاسی نظام تسلیم کر لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان (شاہ صاحبؒ) کی سیاست میں تصوف کو اتنا بلند دینی درجہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب تک حکومت کو چلانے کی استعداد پیدا نہ ہو، کوئی شخص لڑ کر نیا نظامِ حکومت قائم نہیں کر سکتا۔ ہر نئی تحریک کو شروع میں اپنا پیغام دوسروں کو سنانے اور ان کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے عدم تشدد پر لامحالہ عمل کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اسی اصول پر اپنی جماعت تیار کرنا شروع کیا، وہ اس میں کامیاب ہوئے۔'' [۱]

حکیم محمود احمد برکاتیؒ نے شاہ صاحبؒ کی تیار کردہ جماعت کے ۴۷ افراد کی فہرست دی ہے۔[۲] جن میں سے ۳۵ کا تذکرہ القول الجلی میں موجود ہے۔[۳] اسی طرح مولانا نسیم احمد فریدیؒ نے اس جماعت کے ۳۹ افراد کا ذکر کیا ہے۔[۴] شاہ صاحبؒ نے جماعت سازی کے ساتھ ساتھ اپنی سیاسی فکر کو تحریکی شکل دینے کے لیے تربیتی مراکز بھی قائم کیے۔ چنانچہ ظہور الدین بٹ لکھتے ہیں کہ:

> ''ان (شاہ صاحبؒ) کی سیاسی بصیرت اور مستقبل بینی نے ان پر منکشف کر دیا تھا کہ برعظیم پاک و ہند میں ''مسجد'' جو ایک مدرسہ بھی ہوا کرتا تھا کو آزادی کا عظیم مقصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ایسے مدرسے قائم کیے جو ان کی وفات کے بعد ہندی حریت پسندوں کے مراکز بنے رہے۔'' [۵]

شاہ صاحبؒ نے اپنی سیاسی فکر کی تشکیل کے لیے جو تربیتی مراکز قائم کیے ان مراکز میں درج ذیل اہم تھے:

۱۔ پہلا مرکز ''مدرسہ رحیمیہ'' دہلی میں تھا۔ جو شاہ صاحبؒ کی فکری تربیت کا اہم مرکز تھا۔ اس مرکز نے شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد ان کی اولاد کے زیرِ سایہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی تک نمایاں کردار ادا کیا۔

۲۔ دوسرا مرکز رائے بریلی کا مشہور دائرہ تھا۔ جو ''تکیہ شاہ علم اللہ'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہی مرکز ہے جس سے سلطان ٹیپو شہید کا روحانی تعلق تھا۔

۳۔ تیسرا مرکز ''مدرسہ نجیب آباد'' تھا۔ نواب نجیب الدولہ نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔

۴۔ چوتھا مرکز اودھ کا دارالحکومت لکھنؤ تھا۔ جہاں آپ کی جماعت کے ایک فرد مولانا مخدوم لکھنویؒ نے نصف صدی تک شاہ صاحبؒ کی فکر کو عام کیا۔

۵۔ پانچواں مرکز ''مدرسہ ملا محمد معین'' تھا جو ٹھٹھہ سندھ میں قائم تھا۔ ۶

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح شیخ احمد سرہندی (۱۵۷۴ء-۱۶۲۴ء) کے سلسلے کی اشاعت ان کے چار فرزندان گرامی کے ذریعے ہوئی۔ بالکل اسی طرح شاہ صاحبؒ کی فکر کی اشاعت وترویج بھی ان کے چار فرزندانِ گرامی ہی کے ذریعے ہوئی۔ ۷ ان فرزندان گرامی میں شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۷۴۵ء-۱۸۲۴ء) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے اپنے والد ماجد سے علمی اکتساب کیا۔ جب آپ سولہ برس کے تھے تو آپ کے والد ماجد نے انتقال کیا۔ اس کے بعد آپ نے شیخ نور اللہ بڈھانویؒ، شیخ محمد امین کشمیریؒ اور شیخ محمد عاشق پھلتیؒ وغیرہ سے ولی اللّٰہی علوم کو سمجھا۔ آپ پر شاہ صاحبؒ کو اتنا اعتماد تھا کہ خود اپنی زندگی ہی میں اپنے مدرسہ کی تمام ذمہ داریاں ان کو سونپ دی تھیں۔ شاہ صاحبؒ کے انتقال کے بعد وہ ولی اللّٰہی جماعت کے امام بنے اور انہوں نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ ولی اللّٰہی علوم کو عوامی سطح پر متعارف کروایا۔ مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''امام ولی اللہ نے تو دہلی کے اعلیٰ طبقے کو اپنے علوم وافکار سے متعارف کرایا تھا مگر امام عبدالعزیز نے قوم کے متوسط طبقے کو بیدار کر کے عوام کو اس حقیقت سے آشنا کیا..... اگر امام عبدالعزیز اپنے والد ماجد امام ولی اللہ کی حکمت، ان کی فقہ وتصوف وفلسفہ وسیاست کے مخصوص طریقے متوسط طبقے تک نہ پہنچاتے تو آج امام ولی اللہ کو صحیح طور پر پہچاننے والا مشکل سے دستیاب ہوسکتا۔'' ۸

شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد کی فکر کو نوجوان نسل میں منتقل کیا اور ان کی فکری تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان نوجوانوں میں انہوں نے اپنے بھائیوں (شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی)، اپنے داماد (مولانا عبدالحیؒ) اپنے نواسے (مولانا محمد اسحاق اور مولانا محمد یعقوب) اپنے بھتیجے (شاہ اسماعیل شہید) سمیت دیگر سینکڑوں نوجوانوں کو شاہ صاحبؒ کی فکر سے منسلک کیا۔ انہوں نے ولی اللّٰہی فکر پر جماعت کی تیاری کے عمل میں عصری تقاضوں کو بھی پیش نظر رکھا اور اس جماعت کی تربیت درج ذیل طریقوں سے کی۔

۱۔ درس وتدریس ۲۔ روحانی تربیت ۳۔ عام اجتماعات

شاہ عبدالعزیزؒ نے بہت جلد ایک ایسی جماعت تیار کر دی جو فکر وشعور کے اعتبار سے کسی سے مرعوب ہونے والی نہیں تھی۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی تیار کردہ جماعت کی تعداد سینکڑوں میں تھی البتہ ان میں سے ۱۸ افراد کی فہرست مولانا سید محمد میاں نے دی ہے۔ ۹

شاہ صاحبؒ کے عہد میں اس خطے میں انگریز سامراج نوآبادیاتی نظام کی حامل دیگر خارجی قوتوں کو شکست دے کر ایک

نئی طاقت کے روپ میں ابھر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ولی اللّٰہی جماعت نے شاہ صاحبؒ کی فکر کی عملی تشکیل کے لیے اپنی جدوجہد کے رخ کو تبدیل کیا۔ وہ انگریز سامراج جو ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے روپ میں اس خطے میں آیا تھا برعظیم کی داخلی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بتدریج تمام ریاستی امور پر قابض ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ۱۱۷۱ھ/ ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی اور ۱۱۷۹ھ/ ۱۷۶۵ء میں جنگ بکسر کی شکست اور شجاع الدولہ (اودھ) اور شاہ عالم کو شکست ہو چکی تھی۔ ۱۲۱۴ھ/ ۱۷۹۹ء میں سلطنتِ میسور کی شکل میں آخری کرن بھی بجھ گئی تھی۔ ان حالات میں انگریز سامراج کی طرف سے روایتی انداز میں بادشاہ کو معزول کرنے اور شاہی تخت وتاج چھیننے کی بجائے بادشاہت کا وہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو انگلستان کی پارلیمنٹ خود اپنے بادشاہ کے لیے طے کر چکی تھی یعنی بادشاہ کو تخت وتاج کے ساتھ باقی رکھتے ہوئے اختیارات ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے لیے تسلیم کرا لیے گئے۔ اور اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ ''خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا اور حکم کمپنی بہادر کا''۔ ان حالات میں یہ سوال تیزی سے ابھرا کہ ہندوستان کو دارالاسلام (آزاد ریاست) کہا جائے یا دارالحرب (غلام ریاست) کہا جائے۔ ان حالات میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے تمام تحفظات کو بالائے طاق رکھ کر ایک فتویٰ جاری کیا جو غالباً ۱۲۱۸ھ/ ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کے دہلی پر قبضہ کے بعد دیا گیا اور جس کی رو سے ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دے کر قوم کو عملی جدوجہد پر ابھارا گیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے اس فتوے کے اہم مندرجات درج ذیل تھے۔

☆ برصغیر میں انگریز حکمرانوں کا حکم بلا روک ٹوک جاری ہے۔

☆ قانون سازی کے جملہ اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں ہیں۔

☆ مذہب کا احترام ختم کر دیا گیا ہے۔

☆ شہری آزادی سلب کر لی گئی ہے۔[۱۰]

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے اس فتوے کی رو سے ہر محب وطن کا فرض تھا کہ اس اجنبی طاقت سے اعلانِ جنگ کر دے اور جب تک اس کو ملک بدر نہ کر دے اس ملک میں زندہ رہنا اپنے لیے حرام جانے۔ اس فتوے نے برصغیر کے عوام میں آزادی وحریت کے حقیقی معنوں کو اجاگر کیا اور ان کی دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دیا۔ ڈاکٹر ثریا ڈار نے بجا طور پر لکھا ہے کہ انہوں (شاہ عبدالعزیزؒ) نے ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دے کر غلامی کے طوق سے نجات دلانے کی طرح ڈالی۔[۱۱] مولانا ابوالحسن علی ندوی (۱۹۱۴ء-۱۹۹۹ء) لکھتے ہیں کہ:

> ''ہمارے علم میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس وقت ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دینے کی جرأت کی اور صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے فقہ واصول فقہ کی روشنی میں مسئلہ کی ایسی تنقیح کی جس سے ان کی بصیرت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اخلاقی ودینی جرأت کا بھی۔''[۱۲]

یہ بات درست ہے کہ شاہ عبدالعزیزؒ نے انگریز سامراج کے استعماری عزائم کا پردہ فاش کیا اور ان کے خلاف آزادی کی جنگ میں بھرپور اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اپنے حقیقت پسندانہ ذوق کی بناء پر وہ محض جذباتیت اور نفرت کو اپنی تحریک کا حصہ نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں اور جدید علوم کی تحصیل بھی کریں۔ یہی وجہ ہے کہا

آپ نے انگریز سامراج کی مخالفت کے باوجود ان کے کالجز میں تعلیم کا فتویٰ بھی دیا۔ شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ:

''جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامل تھے تو آپ (شاہ عبدالعزیزؒ) نے ان سب کے شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا۔''[۱۳]

یہ شاہ عبدالعزیزؒ کی بصیرت اور مستقبل بینی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ آج نہیں تو کل لامحالہ دینی و دنیاوی تعلیم کی دوہری تقسیم کا سامراجی منصوبہ عمل پذیر ہوگا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے خود کو محض درس و تدریس تک ہی محدود نہیں رکھا تھا کہ فتوے دیکر مطمئن ہو جاتے بلکہ انہوں نے ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دیدیے جانے کے بعد انگریز کے انخلاء اور ولی اللّٰہی فکر کی بنیاد پر اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے عملی جدوجہد میں بھی حصہ لیا۔ چنانچہ انہوں نے ولی اللّٰہی فکر کو اس دور کے تقاضوں کے مطابق منظم کر کے اسے تنظیمی بنیادوں پر کھڑا کیا اور نوجوانوں پر مشتمل اس جماعت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے شاہ صاحبؒ کے بتائے ہوئے اصولِ اجتماع کو عملی جامہ پہنایا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں نئی ابھرتی ہوئی سامراجی قوت کو شکست دینے کے لیے عسکری اور تنظیمی ونگ قائم کر کے منظم جدوجہد کرنا ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے عسکری ونگ کا امیر سید احمد (۱۷۸۶ء-۱۸۳۱ء) کو مقرر کیا جو عسکری صلاحیت کے حامل تھے اور ان کی مدد کے لیے مولانا اسمٰعیل (۱۷۷۹ء-۱۸۳۱ء) اور مولانا عبدالحیؒ کو بطور مشیر مقرر کیا۔ اس ونگ کی ذمہ داریاں درج ذیل تھیں:

۱۔ ملک بھر کے دورے کر کے ہندوستانی عوام میں انقلابی روح بیدار کرنا۔

۲۔ ملک بھر سے رضا کاروں کی بھرتی اور ان کی فوجی تربیت کرنا۔

۳۔ مالی معاملات کو سنبھالنا اور اس کی فراہمی کا بندوبست کرنا۔

۴۔ دیگر ممالک سے تعلقات قائم کرنا۔

۵۔ فوجی کارروائی یعنی باضابطہ جنگ کرنا۔

البتہ تنظیمی ونگ کی قیادت انہوں نے اپنے پاس رکھی اور مولانا محمد اسحاق دہلوی کو ہر معاملے میں اپنے ساتھ شریک رکھا۔ اس ونگ کی ذمہ داریاں درج ذیل تھیں:

۱۔ مرکز (دہلی) کو سنبھالنا۔

۲۔ تعلیم و تربیت کو جاری رکھنا۔

۳۔ ملک میں انقلابی فضا کو سازگار بنانا۔

۴۔ نئے رضا کاروں کی ذہن سازی کرنا۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ اس حوالے سے فرماتے ہیں کہ:

''عسکری امور کے لیے سید احمد شہید امیر اور مولانا عبدالحیؒ اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید مشیر مقرر ہوئے۔ امام

عبدالعزیز نے اپنی تمام جماعت کو حکم دیا کہ جس معاملے میں تینوں جمع ہو جائیں اس کو امام عبدالعزیز کا حکم سمجھنا چاہیے۔ تنظیمی امور کے لیے آپ نے مولانا محمد اسحاق کو ہر معاملے میں اپنے ساتھ شریک رکھ کر لوگوں کو سمجھا دیا کہ ان کا حکم میرا حکم ہے۔'' ۱۴

شاہ عبدالعزیزؒ کے قائم کردہ عسکری ونگ میں سید احمد شہید کو ان کی عسکری وفوجی صلاحیت اور تجربے کی بنیاد پر امیر بنایا گیا تھا ورنہ علمی اعتبار سے ان کا شاہ اسمٰعیل شہید سے کوئی تقابل نہیں تھا۔ اس سے جہاں اس ولی اللّٰہی جماعت کا نظم ونسق نمایاں ہوتا ہے وہیں اقرباء پروری کی بھی نفی ہوتی ہے۔ بہرحال اس عسکری ونگ نے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا اور ملک کے طول وعرض کے دورے کر کے آزادی وحریت کے متوالوں کی ایک بڑی انقلابی جماعت تیار کر لی۔ اس دوران انہوں نے سماجی اور معاشرتی اصلاح کا کام بھی بڑے احسن طریقے سے کیا۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے اس جماعت کی انسان دوستی، خدمت خلق، مساوی حقوق اور عدم تشدد کے اصولوں پر تربیت کی تھی۔ ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء میں ولی اللّٰہی جماعت کا یہ ونگ سید احمد شہید کی سرکردگی میں حج کے لیے روانہ ہوا۔ یاد رہے کہ اس دور میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی (۱۷۰۳ء-۱۷۹۲ء) کی تحریک نے حجاز کے بیشتر حصے کو متاثر کر رکھا تھا۔ بعض محققین نے انگریزوں کے پروپیگنڈے میں آ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ سیدین کی تحریک وہابی تحریک سے متاثر ہوئی تھی۔ نیز سیدین کی یہ تحریک دراصل انگریزوں کی بجائے سکھوں کے خلاف تھی۔ ۱۵ تاہم یہ دعوے تاریخی شواہد اور حقائق کے برخلاف اور تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہیں۔ اس حوالے سے مولانا سندھیؒ، مولانا غلام رسول مہرؒ اور سید محمد میاںؒ نے بھرپور دلائل سے ان دعووں کی تردید اور نفی کی ہے۔ ۱۶ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو شاہ عبدالعزیز ''فتویٰ دارالحرب'' انگریز کے خلاف دے رہے ہیں اور وطن کی آزادی کو فرض قرار دے رہے ہیں اور دوسری جانب ان کی تحریک کو سکھوں سے منسوب کیا جا رہا ہے۔ بہرحال یہ قافلہ سفر حج سے واپس ہو کر ابھی دہلی واپس نہیں پہنچا تھا کہ ۱۶ رمئی ۱۸۲۴ء کو ولی اللّٰہی فکر کے پہلے دور کا یہ دوسرا امام مسلسل تریسٹھ سالہ جدوجہد کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے انتقال کے بعد شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کو جو تنظیمی ونگ میں شاہ عبدالعزیزؒ کے دست راست تھے، ان کا جانشین مان لیا گیا۔ عسکری ونگ کی قیادت نے بھی ان کی امامت کو تسلیم کر لیا۔ ان کی امامت میں سیدین نے بالاکوٹ کے مقام پر ۱۱۴۴ھ/ ۱۷۳۱ء میں جبکہ ولی اللّٰہی فکر کے اس پہلے دور کے سو سال مکمل ہو چکے تھے حکومت مؤقتہ قائم کی۔ بعض لوگوں کی رائے میں یہ واقعہ شاہ عبدالعزیزؒ کی کاوش نہیں تھی بلکہ سید احمد شہید کا ذاتی کارنامہ تھا لیکن مولانا سندھیؒ نے اس کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہمارے نزدیک سرحد پار کی حکومت مؤقتہ کا قیام وراصل امام عبدالعزیز ہی کی تحریک کا نتیجہ تھا۔ بعض حلقوں کی طرف سے سید صاحب کو بڑی کشف وکرامت کا مالک بنا کر ساری جماعت کا امام منوایا گیا ہے۔ یہ چیز حقیقت کے سراسر خلاف ہے..... جماعت کے اصل امام، امام عبدالعزیز تھے۔'' ۱۷

جس طرح شاہ ولی اللہؒ نے مرہٹوں کے زور کو توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی (۱۷۲۲ء-۱۷۷۲ء) سے مدد طلب کی

تھی اسی طرح شاہ عبدالعزیزؒ چاہتے تھے کہ سکھوں کے خلاف جو پنجاب پر قابض تھے، افغانوں سے مدد لی جائے اور پنجاب کی اس باغی حکومت کو ختم کر کے کابل اور دہلی کا پھر سے اتصال قائم کر دیا جائے۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے اس فیصلے پر تنقید کی جاسکتی ہے کیونکہ انگریز سامراج نے اپنے نوآبادیاتی نظام کے تحت جغرافیائی لکیروں کو بہت گہرا کر دیا تھا اور اب حالات پہلے جیسے نہ تھے۔ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر شاہ عبدالعزیزؒ زندہ ہوتے تو اس تحریک کا طریقہ کار اور لائحہ عمل کیا ہوتا؟ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس تحریک میں بعض مواقع پر حالات وزمانہ کی رعایت کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ۱۸ اور تحریک کو ابتدائی کامیابیوں کے بعد ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا سندھیؒ نے بھی بعض مقامات پر اس تحریک کے بعض فیصلوں پر تنقید کی ہے ۱۹ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ برعظیم کی تاریخِ آزادی میں اس تحریک کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۱ء میں بالاکوٹ کے مقام پر سیدین کی یہ تحریک وقتی شکست سے دوچار ہوئی اور سیدین کی شہادت نے اس تحریک کو اگلے دور میں داخل کیا۔ مولانا سندھیؒ اس تحریک کی ناکامی سے مایوس نہیں تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''پہلے زمانے میں ہم ان واقعات کو پڑھ کر رد لیتے اور زمانے کی شکایتیں کرتے کہ لوگ اسلام سے بہت دور ہوگئے ہیں مگر بعد میں یورپ کی انقلابی تحریکوں کی تاریخ پڑھنے سے ہمارے تمام خدشات رفع ہوگئے۔ ہم نے دیکھا کہ اس طرح کی انقلابی تحریکیں بار بار شکست کھاتی ہیں تب کہیں برگ وبار لاتی اور اپنی منزل مقصود پر پہنچتی ہیں۔'' ۲۰

ایک طرف تو ''عسکری ونگ'' شکست سے دوچار ہوا تو دوسری طرف ''تنظیمی ونگ'' بدستور کام کرتا رہا۔ چنانچہ وہ مسلمان جنہوں نے تقریباً پچیس برس بعد جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں حصہ لیا ان کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی ونگ سے تھا۔

(ب) ولی اللّٰہی تحریک کا دوسرا دور

معرکہ بالاکوٹ کے بعد ولی اللّٰہی جماعت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس حوالے سے ظہورالدین بٹ لکھتے ہیں کہ:

> ''سید احمد شہید کے بعد تحریک کے دو مرکز ہوگئے۔ دہلی کے پرانے مرکز نے انقلاب کے لیے وہ راہ اختیار کی جو ہندو مسلم اشتراک اور متحدہ محاذ کی اساس بنی اور بعد ازاں (تقریباً پچاس سال بعد) انڈین نیشنل کانگریس کا بنیادی مقصد قرار پائی۔ اسے بعد میں متحدہ قومیت کا نام دیا گیا۔ دوسرے مرکز صادق پور کا طریقہ کار اور لائحہ عمل وہی انقلابی رہا یعنی ہجرت، جہاد اور انگریز کو ملک بدر کرنے کے لیے تن من دھن کی قربانی۔'' ۲۱

ایک طرف صادق پور کے مرکز نے جماعت میں تقسیم کا عمل کیا اور جذباتیت کی بنا پر انگریز سامراج کے ''وہابیت'' کے پروپیگنڈے کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کی جماعت میں ایک اور مخالف جماعت دہلی میں پیدا ہوگئی چنانچہ مولانا نذیر حسین دہلوی اور مولانا شیخ محمد تھانوی ۲۲ اس دوسری جماعت کے افراد ہیں۔ معرکہ بالاکوٹ کے بعد ولی اللّٰہی جماعت جس کس مپرسی کے عالم میں تھی اس کو امام شاہ محمد اسحاق دہلوی (۱۷۷۲ء-۱۸۴۵ء) نے بخوبی سنبھالا۔ ان کی موجودگی میں ولی اللّٰہی جماعت نے نامساعد حالات میں بھی اپنا سفر جاری رکھا۔ انہوں نے ولی اللّٰہی تحریک کے اس

دوسرے دور میں درج ذیل حکمت عملی اپنائی۔

۱۔ انہوں نے ولی اللّٰہی تحریک کو جذباتیت کے عنصر سے پاک کرنے اور اس تحریک کی وہابی تحریک سے مماثلت کے غلط پروپیگنڈے کے خاتمے کے لیے حنفی مسلک کی پابندی کو ضروری قرار دیا۔

۲۔ انہوں نے تصوف کے منکرین کو اپنی جماعت سے علیحدہ کر دیا اور روحانی تربیت کے لیے تصوف کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

۳۔ انہوں نے سلطنتِ دہلی کی بجائے خلافتِ عثمانیہ سے اشتراک عمل کیا۔ اور ولی اللّٰہی جماعت کے مرکز کو دہلی سے مکہ معظمہ لے گئے۔ ترکی خلافت سے اتصال کی وجہ یہ تھی کہ یمنی اور نجدی تحریکات ان کے کام میں دوبارہ رکاوٹ نہ بنیں۔ نیز ترکوں اور ان کے حلیفوں سے مدد لے کر ہندوستان کی تحریک حریت کو کامیاب بنایا جا سکتا تھا۔

۴۔ انہوں نے برعظیم میں ولی اللّٰہی جماعت کا ایک بورڈ تشکیل دیا جس میں مولانا مملوک علی نانوتویؒ کی صدارت میں مولانا قطب الدین دہلویؒ، مولانا مظفر حسین کاندھلویؒ اور مولانا عبدالغنی دہلویؒ شامل تھے۔ اس بورڈ کی نگرانی وہ مکہ معظمہ سے کرتے تھے۔ شاہ محمد اسحاق دہلویؒ ۱۸۴۶ء میں وفات پا گئے اور ان کے انتقال کے بعد اس کام کو مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے جاری رکھا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ لکھتے ہیں کہ:

''ولی اللّٰہی تحریک کے دوسرے دور میں مولانا محمد اسحاق کی مرکزی جمعیت حجاز میں بیٹھ کر ہندوستان میں اس تحریک کے کاموں کی رہنمائی کرتی رہی۔ مولانا محمد اسحاق اور ان کے بعد امیر امداد اللہ کو مکہ معظمہ کے قیام کے دوران میں اپنی تحریک کو جاری رکھنے میں جس قدر مشکلات پیش آئیں، ان پر غالب آنا ان کے حزم اور حلم کی روشن دلیل ہے۔''[۲۳]

شاہ محمد اسحاق دہلویؒ نے مکہ معظمہ میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۸۱۷ء-۱۸۹۹ء) کو برصغیر کے معروضی حالات میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار کیا، چنانچہ انہوں نے برصغیر واپس آ کر ولی اللّٰہی تحریک کو ایک نیا رخ دیا۔ ان کی آمد سے قبل مولانا مملوک علیؒ (جو کہ شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے) نے ولی اللّٰہی جماعت کی ذہن سازی اور فکری تربیت میں پورا کردار ادا کیا۔ تحریکِ بالاکوٹ کے منطقی انجام کے بعد عوام الناس میں حریت و آزادی کے نئے ولولے نے جنم لیا۔ چنانچہ پورے ملک میں آزادی کی تحریکات جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی چلی گئیں۔ اس دوران دہلی سے ایک فتویٰ جاری ہوا جس کی رو سے ہندوستان میں انگریز سامراج کے خلاف سخت مزاحمت کا اعلان کیا گیا تھا اور اس فتویٰ پر اس وقت کے ۳۳ جید علماء دین نے دستخط کیے تھے۔[۲۴] اس دوران حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے ولی اللّٰہی جماعت کے عسکری ونگ کو منظم کیا اور مستقبل کا لائحہ عمل متعین کیا۔ شاہ محمد اسحاقؒ نے جب سے مرکز کو دہلی سے مکہ معظمہ منتقل کیا تھا تب سے ''مدرسہ رحیمیہ'' دہلی کی مرکزیت بھی ختم ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے اپنے وطن تھانہ بھون کو تحریک کا نیا مرکز بنایا۔[۲۵] انہوں نے خطے کے بدلتے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھا کر ولی اللّٰہی جماعت کو از سرِ نو منظم کیا اور ان کا اجلاس طلب کیا، جس میں مفتی صدرالدین آزردہؒ کے فتویٰ جہاد کی توثیق کی[۲۶] اور اس کی بنیاد پر انگریز سامراج کے ظالمانہ تسلط کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۳ء-۱۸۵۶ء) لکھتے ہیں کہ:

''حضرت اقدس مولانا حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہٗ مرکز بیعت جہاد تھے اور حضرت اقدس مولانا حافظ محمد

ضامن شہید سب سے بڑے علم بردارِ جہاد تھے، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہٗ جامع مجاہدین تھے کہ وعظ و پند، ترغیب و ترہیب سے مجاہدین کو مختلف مواقع، دیہات وقصبات سے جمع کر کر کے میدان میں لائیں، حضرت نانوتوی قدس سرہ امیر عسکر تھے۔'' ۲۷

ولی اللّٰہی جماعت کا ارادہ یہ تھا کہ تھانہ بھون سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچیں اور ولی اللّٰہی تحریک کو خطے کی دیگر اجتماعی تحریکات سے مل کر مزید موثر بنایا جائے۔ اس ضمن میں ولی اللّٰہی جماعت نے ابتدائی طور پر کافی کچھ کامیابی سمیٹی اور انگریزوں کو کافی نقصان پہنچایا تاہم شاملی کے میدان میں حافظ ضامن شہید کی شہادت سے یہ تحریک پسپا ہوئی۔ دوسری طرف جنگ آزادی کی دیگر تحریکات کو بھی ظلم و جبر کے ذریعے دبا دیا گیا اور آخری مغل حکمران بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر دیا گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی (۱۸۳۳ء-۱۸۸۰ء) روپوش ہو گئے، مولانا رشید احمد گنگوہی (۱۸۲۹ء- ۱۹۰۵ء) اور مولانا فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۷ء-۱۸۶۱ء) کو گرفتار کر لیا گیا جبکہ حاجی امداد اللہؒ مولانا گنگوہیؒ اور مولانا نانوتویؒ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال بعد دوبارہ مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور ولی اللّٰہی جماعت کی آئندہ کی حکمتِ عملی پر غور و فکر کرنے لگے۔ مولانا محمد میاںؒ لکھتے ہیں کہ:

''تحریک ۱۸۰۵ء کی ناکامی کے بعد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے اسی مرکز کا رخ فرمایا اور غیر معمولی مشکلات اور پریشانیاں برداشت کر کے مکہ معظمہ میں بیٹھ کر آخر تک ہندوستانی تحریک کی قیادت فرماتے رہے۔'' ۲۸

بظاہر تو یہ جنگِ آزادی ناکام ہو گئی تھی لیکن اس دوران ''ایسٹ انڈیا کمپنی'' نے جو غیر انسانی مظالم ڈھائے اس نے ایک نئی تاریخ کو جنم دیا اور برصغیر کی حکومت تاج برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے ولی اللّٰہی فکر کو اگلے مرحلے میں داخل کر دیا۔ چنانچہ ولی اللّٰہی جماعت نے برعظیم کی اس اجتماعی تحریک کی ناکامی کے بعد نئے سرے سے منصوبہ بندی کی اور بقول مولانا سندھیؒ ولی اللّٰہی جماعت نے فیصلہ کیا کہ دہلی کے اطراف میں امام عبدالعزیزؒ کے مدرسہ کے نمونہ پر ایک مدرسہ بنایا جائے۔ چنانچہ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سات سال تک مسلسل کوشش کرتے رہے، تب کہیں جا کر ۱۲۸۳ھ/ ۱۸۶۶ء میں مدرسہ دیوبند کی تاسیس ہو سکی۔ ۲۹ اسی طرز پر سہارن پور اور مراد آباد میں بھی نئے تربیتی مراکز قائم کیے گئے تاکہ ولی اللّٰہی فکر کو اگلے دور میں داخل کیا جا سکے۔ اس حوالے سے سید محبوب رضوی لکھتے ہیں کہ:

''اس وقت بنیادی نقطۂ نظر یہ قرار پایا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لیے ایک دینی و علمی درسگاہ کا قیام ناگزیر ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ اب دہلی کی بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونی چاہیے۔'' ۳۰

مولانا نانوتویؒ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد کے نامساعد حالات میں ولی اللّٰہی تحریک کے فروغ کے لیے جو طریقہ کار وضع کیا اس کے بنیادی اصول درج ذیل تھے۔

۱۔ ولی اللّٰہی طریقے کی اساس پر دینی فنون کی طرف دعوت دینا۔

۲۔ کتاب و سنت کو تمام مسلمانوں کے طبقات میں پھیلانے کے لیے جدوجہد اور کوشش کرنا۔

۳۔ قابض اور مسلط حکومت سے تعاون لیے بغیر اپنا مال اور جان خرچ کرنا۔

۴۔ امام ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے میں تجدید کر کے ہندوستان میں دین کے غلبے کی تحریک کو نئے رخ پر ڈالنا۔

۵۔ فلسفہ ولی اللّٰہی کے اصولوں میں انتہائی عمیق غور وخوض کر کے اسے ہندوستان کے لوگوں کی ذہنیت کے قریب بنانا۔

۶۔ ماہرینِ فلسفہ کی ''مخصوص اصطلاحات'' کو چھوڑ کر، عام ہندوستانیوں کی زبان میں بات کرنا۔۳۱

اس دور میں ولی اللّٰہی جماعت کی فکری رہنمائی ان کے مرشد مولانا حاجی امداد اللہ مکہ میں بیٹھ کر کرتے رہے۔ چنانچہ حاجی امداد اللہؒ کو جب بتایا گیا کہ دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا ہے تو اس پر آپ نے فرمایا کہ:

''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے۔ یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں، اوقات سحر میں سربسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاءِ اسلام اور تحفظِ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔ یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔''۳۲

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے دیوبند کی تاسیس کے بعد مدرسہ دارالعلوم دیوبند کو ولی اللّٰہی تحریک کا نیا مرکز بنایا اور ولی اللّٰہی فکر کی اساس پر اس مدرسہ کو ترقی دی۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کی تیار کردہ جماعت کے فرد مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (جو کہ ولی اللّٰہی فکر کے بہترین شارح تھے) کی شکل میں ایک بہترین رہنما مل گیا جو شریعت، طریقت اور سیاست کا جامع اور اپنی ذات میں خود ایک انجمن تھا۔ ان کے ساتھ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی شکل میں ایسا فقیہ مل گیا جس نے اپنے فتاویٰ سے قوم کی درست سمت پر رہنمائی کر کے شاہ عبدالعزیزؒ کی یاد دلا دی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برعظیم کی تمام قومیں رنگ، نسل اور مذہب کی تفریق کے باوجود اجتماعی جدوجہد میں برابر طور پر شریک ہوئی تھیں۔ یقیناً اس جنگ میں مسلمانوں کو ہندوؤں کی بانسبت زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا لیکن ہندو قوم بھی آزادی وحریت کی اس جنگ میں برابر کی شریک تھی۔ برعظیم کی اس اجتماعی تحریک نے انگریز سامراج کو کافی پریشان کر دیا تھا اور وہ ان میں باہمی پھوٹ اور مذہبی اختلافات کو ہوا دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہوا۔ اسی دوران ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا جس میں اجتماعی جدوجہد کی فکر کا اعادہ کیا گیا تھا۔ اس ادارے نے اس درجہ ترقی کی کہ بقول مولانا حسین احمد مدنی (۱۸۷۹ء- ۱۹۵۷ء) انگریز سامراج کے دماغ ماؤف ہو گئے۔۳۳ چنانچہ اس نے چند علماء کو اپنا ہمنوا بنا کر ان سے فتویٰ شائع کروایا، جس کی رو سے مسلمانوں کی کانگریس میں شرکت حرام قرار دی گئی۔ اس موقع پر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اس پروپیگنڈے کی نفی کرتے ہوئے مسلمانوں کو کانگریس میں جانے کا مشورہ دیا اور اس کے جواز میں فتاویٰ لکھے تاکہ اجتماعی جدوجہد کے نتیجے میں اس خطے سے انگریز سامراج کو جلد از جلد نکالا جا سکے۔

۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰ء میں مولانا احمد علی سہارنپوریؒ اور مولانا نانوتویؒ کا انتقال ہو گیا، اس لیے یہ سال ہندوستان کی تاریخ میں عام الحزن (غم کا سال) کہلاتا ہے۔۳۴ چنانچہ ''مظاہر العلوم'' اور ''دارالعلوم'' دونوں مدرسے یتیم ہو گئے۔ ان کٹھن حالات میں مولانا گنگوہیؒ نے ان ولی اللّٰہی فکر کے مراکز کی مستقل سرپرستی فرمائی۔ چنانچہ مولانا نانوتویؒ کے انتقال کے بعد ولی اللّٰہی

جماعت کے مراکز کو مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے سنبھالا اور شیخ الہند مولانا محمود حسن (۱۸۵۱ء-۱۹۲۰ء) کی فکری تربیت کی تاکہ وہ ولی اللّٰہی جماعت کی ان کے بعد رہنمائی کے فرائض سرانجام دیں۔ چنانچہ ۱۲۹۴ھ/ ۱۸۷۷ء میں جب مولانا نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حج کے لیے روانہ ہوئے تو مولانا محمود حسنؒ بھی ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے حاجی امداداللہ سے آپ کو بیعت کروایا۳۵ اور اس قیام کے دوران ولی اللّٰہی جماعت کی آئندہ کی حکمتِ عملی اور ان کے کردار کے حوالے سے انہیں تیار کیا گیا۔ مولانا نے واپس آکر ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء میں ''دارالعلوم'' میں ''ثمرۃ التربیت'' کے نام سے نوجوان طلباء وفضلاء کی جماعت تشکیل دی۔۳۶ اس جماعت کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے ایچ۔ بی خان لکھتے ہیں کہ:

''(اس کا مقصد یہ تھا کہ) حصول آزادی کے سلسلے میں ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان خصوصاً اسلامی ممالک سے روابط پیدا کر کے آزادی پسند ممالک کا تعاون حاصل کیا جائے۔ چنانچہ مدرسہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلباء کو افغانستان، ایران، بغداد اور عرب وغیرہ ممالک میں بھیجا گیا۔ جنہوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے خفیہ طور پر اہم کردار ادا کیا۔''۳۷

''ثمرۃ التربیت'' نے تیس اکتیس سال تک مسلسل اور خفیہ کام کیا اور اس مدت کے تمام حالات صیغہ راز میں ہیں۔ اس تنظیم کا پبلک محاذ ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں ''جمعیۃ الانصار'' کے قیام سے عوام کے سامنے منظرِ عام پر آیا۔ یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ ''ثمرۃ التربیت'' مولانا نانوتوی کی حیات میں قائم ہوئی تھی اور اس کے قیام کے دو سال بعد یعنی ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰ء میں مولانا نانوتویؒ کا انتقال ہوگیا۔ چنانچہ مولانا محمد ناصر نے لکھا ہے کہ:

''دارالعلوم سے فراغت پانے والے اور اپنے ساتھ منسلک طلبہ کی سیاسی تربیت کے مقصد کے پیشِ نظر آپ (مولانا محمود حسنؒ) نے اپنے استاد جلیل مجاہدِ حریت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ایماء پر فضلاء اور بہی خواہانِ تحریک دارالعلوم کی انجمن ''ثمرۃ التربیت'' کے نام سے قائم کی۔''۳۸

حتمی طور پر یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ ''ثمرۃ التربیت'' کب تک قائم رہی تاہم ۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۹ء میں ''جمعیۃ الانصار'' کے قیام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ دراصل ''ثمرۃ التربیت'' ہی کی ترقی یافتہ شکل تھی۔ اس کی تائید مولانا محمد میاں نے بھی کی ہے۔۳۹ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے قابل شاگرد مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو ''جمعیۃ الانصار'' کا ناظم بنایا۔ اس حوالے سے مولانا سندھیؒ خود لکھتے ہیں کہ:

''۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں حضرت شیخ الہند نے مجھے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا۔ چار سال تک ''جمعیت الانصار'' میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیت کی تحریک تاسیس میں مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابومحمد احمد لاہوری اور عزیزمی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔''۴۰

مولانا محمد میاںؒ کی تحقیق کے مطابق اس تحریک سے قبل شیخ الہندؒ نے مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری (۱۸۵۳ء-۱۹۱۹ء)، مولانا خلیل احمد سہارنپوری (۱۸۵۲ء-۱۹۲۷ء) اور مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ء-۱۹۴۳ء) کو جمع کر کے زمانے

کی موجودہ ضرورتیں ان کے سامنے پیش کیں۔ مولانا تھانویؒ نے تو معذرت فرمالی البتہ باقی حضرات نے موافقت کی۔ ۴۱
مولانا سندھیؒ نے ''جمعیۃ الانصار'' کو قدیم طلباء کی تنظیم سے آگے بڑھا کر اس میں جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی شامل کیا ۴۲ اور یقیناً یہ عمل انہوں نے شیخ الہندؒ کے حکم پر کیا تھا۔ تاہم دارالعلوم کے اندرونی حالات مولانا محمد احمد (فرزند مولانا نانوتوی و مہتمم دارالعلوم) کے اہتمام میں کافی تبدیل ہو چکے تھے جو دارالعلوم کو سیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ارباب مدرسہ کو حضرت شیخ الہندؒ کی قائم کردہ ''جمعیۃ الانصار'' ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس پر شیخ الہندؒ نے باہمی محاذ آرائی سے بچنے کی خاطر ''جمعیۃ الانصار'' کا مرکز تبدیل کر کے دہلی منتقل کر دیا اور ''نظارۃ المعارف القرآنیہ'' کے نام سے ۱۳۳۲ھ/ ۱۹۱۳ء میں دہلی میں مولانا سندھیؒ ہی کی نظامت میں اس نے کام شروع کیا۔ اس ادارہ کا مقصد جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی سیاسی تربیت کرنا اور شاہ ولی اللہ کے فکر و فلسفہ کے مطابق ہندوستان کے معروضی حالات میں سیاسی رہنمائی کرنا تھا۔

شیخ الہندؒ نے شاہ ولی اللہؒ کی سیاسی تحریک میں عصری علوم کے حاملین کو بھی شامل کیا اور اس طرح انگریز سامراج کی تعلیمی و فکری تقسیم کی حکمتِ عملی کو ناکام بنا دیا۔ اس حوالے سے مولانا سندھیؒ لکھتے ہیں کہ:

> ''مولانا شیخ الہند نے علی گڑھ کالج کے انقلابی عنصر کو اپنی تحریک میں شامل کر لیا تھا۔ ان کے پارٹی پروگرام چلانے والے ایک طرف مولانا کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد تھے، تو ان کے ساتھ ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی (جوہر) مساوی درجہ پر شریک تھے۔'' ۴۳

شیخ الہندؒ اپنی پیش بینی اور عبقریت کی بنا پر بھانپ گئے تھے کہ ولی اللّٰہی فکر کو اس دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور اس کی بنیاد پر حریت و آزادی کی جد و جہد کو کامیاب بنانے کے لیے، دارالعلوم (دینی) اور علی گڑھ (عصری) کے اداروں کو مل کر کام کرنا ہوگا۔ انہوں نے اپنی اس سوچ کا اظہار اپنی آخری تقریر میں کیا جو انہوں نے جامعہ ملیہ کے تاسیسی جلسے میں کی اور ناسازی طبع کے باعث آپ کی یہ تقریر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے پڑھ کر سنائی تھی۔ شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ:

> ''اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا۔ اور جس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا، کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو محروم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں۔ لیکن اہلِ نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں لیکن اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔'' ۴۴

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ولی اللّٰہی تحریک کی کامیابی کے لیے ہندو مسلم سمیت برعظیم کی دیگر قوموں کی اجتماعی جد و جہد سے ہی کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ نیز عدمِ تشدد کا طریقہ زیادہ سود مند اور موثر ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ فکر کانگریس کی فکر کے مماثل تھی اور انہوں نے اس حوالے سے کانگریس کی ہمیشہ حمایت کی۔

فرماتے ہیں کہ:

''دونوں قومیں (ہندو مسلم) مل کر ایک ایسے زبردست دشمن کے مقابلے میں لیے کھڑے ہو جاؤ جو تمہارے ملک میں تمہاری آزادی کو پامال کر رہا ہے۔''[۴۵]

۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء میں دنیائے اسلام پر ایک نئی مصیبت وارد ہوئی۔ وہ یہ کہ انگریزوں اور ان کی ہمنوا حکومتوں نے بلقان کی ریاستوں کو ترکوں کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بقول طرابلس اور بلقان کے زہرہ گداز مظالم اور اندرونِ ہند میں انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں نے انہیں (مولانا محمود حسنؒ کو) اس قدر متاثر کیا کہ آرام و چین حرام ہو گیا اور بہت بے چین ہو گئے۔ اسی دوران ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب ان کے نزدیک وہ وقت آ گیا تھا کہ برطانیہ کے خلاف منظم کارروائی کا آغاز کر دیا جائے۔ انہوں نے ایک منصوبہ کے تحت مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو افغانستان بھیجا، جہاں شیخ الہندؒ کی غیر منظم جماعت ان کی منتظر تھی۔ مولانا سندھیؒ کی ذمہ داری تھی کہ افغانستان کی حکومت سے رابطہ کر کے ہندوستان کی آزادی کے لیے راہ ہموار کریں اور ترکی، روس، جرمنی اور جاپان کو بھی اس مقصد پر تیار کیا جائے۔ شیخ الہندؒ مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری (۱۸۵۳ء - ۱۹۱۹ء) کو ہندوستان میں اپنا قائم مقام بنا کر خود حجاز کی جانب روانہ ہوئے تا کہ اپنے اتحادیوں کی مدد سے ہندوستان سے انگریز سامراج کو دیس نکالا دیا جائے۔ تاہم ان کے جانے کی خبر انگریز کے جاسوسی ادارے کے ذریعے پتہ چل گئی اور ان کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے۔ دوسری طرف مولانا سندھیؒ نے ان بیرونی طاقتوں کا بیک وقت ہندوستان پر حملے کی منصوبہ بندی کے حوالے سے چند ریشمی خطوط کے ذریعہ شیخ الہندؒ کو مطلع کرنے کے لئے حجاز پہنچانے کی کوشش کی جو بوجوہ ناکام ہو گئی۔ شریف حجاز کی غداری کی وجہ سے شیخ الہند کو حجاز سے گرفتار کر کے مالٹا کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ دولتِ عثمانیہ کے ختم ہونے تک انہیں وہیں رکھا گیا۔ اس دوران مولانا حسین احمد مدنیؒ سمیت ان کے چند ساتھی بھی ان کے ساتھ قید رہے۔ بالآخر ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء میں ہندوستانی قوم کی بیداری اور دباؤ نے انگریز سامراج کو مجبور کیا کہ وہ شیخ الہندؒ کو رہا کر دیں چنانچہ وہ آزاد ہو کر واپس تشریف لائے اور ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ اسی سال ''جمعیۃ علماء ہند'' کی بنیاد رکھی گئی اور شیخ الہندؒ نے اس کی سرپرستی فرمائی تا کہ مستقبل میں ولی اللّٰہی جماعت اس نئے نام سے حریت و آزادی کی اس تحریک میں اپنا کردار ادا کرے۔ بہرحال ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہندؒ کے انتقال کے بعد ولی اللّٰہی فکر کا یہ دوسرا دور بھی اختتام پذیر ہوا۔

(ج) ولی اللّٰہی تحریک کا تیسرا دور

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے انتقال کے بعد ولی اللّٰہی جماعت کی امامت ان کے قابل شاگرد مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے سنبھالی۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد ترین شاگرد تھے جنہوں نے ان کی جماعت کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا، جسے ہم ولی اللّٰہی فکر کا تیسرا دور کہہ سکتے ہیں۔ مولانا سندھیؒ دار العلوم دیوبند سے اپنی تعلیم مکمل کر کے سیدھے بھرچونڈی تشریف لے گئے، جہاں مولانا کے مرشد حافظ محمد صدیقؒ اور ان کے انتقال کے بعد ان کے خلفاء غلام محمد دین پوریؒ اور مولانا تاج محمود امروٹیؒ کے

زیر سایہ روحانی تربیت کے مراحل طے کیے۔ اس دوران انہوں نے 'دارارشاد' کے نام سے مدرسہ قائم کیا اور اس کے نصاب میں شاہ صاحب کی کتب کو بھی داخل کیا۔ ۴۶ تاہم انہیں بہت جلد شیخ الہندؒ نے دوبارہ طلب کرلیا۔ انہوں نے شیخ الہندؒ کے حکم پر ''جمعیۃ الانصار'' اور ''نظارۃ المعارف'' کے پلیٹ فارم سے نوجوانوں میں قرآنی فہم وشعور اور اجتماعی جدوجہد کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ بعدازاں شیخ الہند کے حکم سے کابل تشریف لے گئے۔ کابل پہنچ کر شیخ الہند کی غیر منظم جماعت کو اپنا منتظر پایا۔ انہوں نے ایک طرف اس جماعت کو منظم کیا تو دوسری طرف افغانستان کو ہندوستان کی آزادی میں کردار ادا کرنے کی ترغیب بھی دی۔ وہ ترکی اور جرمن کے نمائندوں سے بھی ملے اور ایک انقلابی منصوبہ بنایا جس کے نتیجے میں ان ممالک نے مشترکہ طور پر ہندوستان سے انگریز سامراج کے انخلاء میں کردار ادا کرنا تھا۔ اس حوالے سے شیخ الہندؒ شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کو اپنا قائم مقام بنا کر خود حجاز تشریف لے گئے تاکہ حجاز اور ترکی کی مدد سے اس منصوبے کو عملی شکل دی جائے۔ مولانا سندھیؒ نے اس خفیہ منصوبہ کی تفصیل چند ریشمی خطوط میں لکھ کر انتہائی رازداری سے سندھ بھیجی تاکہ ولی اللہی جماعت کے افراد اسے حجاز پہنچا دیں، تاہم یہ خطوط بوجوہ شیخ الہندؒ تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑے گئے اور یہ منصوبہ ناکام ہوگیا۔ اس منصوبے کو بعد میں تحریک ریشمی رومال کا نام دیا گیا اور اس کے سرپرستوں میں مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری (۱۸۵۳ء-۱۹۱۹ء) اور مولانا الیاس دہلوی (۱۸۸۵ء-۱۹۴۴ء) جیسے بزرگ بھی شیخ الہندؒ کے ساتھ تھے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد شیخ الہندؒ کو حجاز سے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا اور مولانا سندھیؒ بھی افغانستان سے روس تشریف لے گئے۔

مولانا سندھیؒ نے روس میں اشتراکی انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اپنے سفر میں انہوں نے روس میں نئی بنیادوں پر ایک نئے عالم کو تعمیر ہوتے ہوئے دیکھا۔ نیا روس بالکل لادین تھا اور مولانا پکے دین دار تھے۔ لیکن مولانا کی دین داری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح دینی جذبہ سرگرم پایا۔ انہیں اسلام روسی انقلاب کی ان ساری بلندیوں سے بھی بلند نظر آیا۔ یہ بات درست ہے کہ مولانا نے اس سفر میں مذہبی رجعت پسند قوتوں کو ختم ہوتے دیکھا اور اس کا ان پر گہرا اثر بھی ہوا لیکن وہ ان حالات میں بھی روسی حکومت کو ولی اللہی فکر کی اہمیت سمجھاتے رہے، جس کے وہ قائل بھی ہوئے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:

> ''ایک بار ایک موقع پر جہاں بڑے بڑے مدبر، پروفیسر اور ادیب جمع تھے، کارل مارکس کی تعریف کرنے لگے۔ میں مارکس کی تمام کتابیں دیکھ چکا تھا۔ مجھ سے پوچھا ایسا نظریہ اس سے پہلے تم نے دیکھا ہے؟ میں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی مفکر ہندوستان، فلاسفر، کارل مارکس سے ایک سو سال پہلے ہوئے ہیں جن کے ہم پیرو ہیں۔ انہوں نے کارل مارکس کی پیدائش سے ایک سو سال پہلے اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ روسیوں نے کہا کہ وہ کتابیں کہاں اور کون کون سی ہیں؟ میں نے ان تمام کے نام بتائے۔ جب انہوں نے دیکھا تو سب نے متفقہ طور پر کہا کہ ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ کارل مارکس اس نظریہ کا موجد ہے۔ مگر یہ تو سب کچھ اس سے پہلے موجود تھا۔'' ۴۷

مولانا سندھیؒ روس میں کچھ عرصہ قیام کے بعد اپنی اصل منزل ترکی کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں انہوں نے خلافتِ عثمانیہ کو ختم ہوتے اور مصطفیٰ کمال اتاترک کی رہنمائی میں ترکی کی نشاۃ ثانیہ کا عمل اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ''خلافتِ عثمانیہ'' مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کا نشان اور قوت کا مظہر تھی۔ اس کی بقا کے لیے ہندوستان نے تحریک خلافت کی مہم چلائی مگر اس میں ناکامی ہوئی۔

مولانا سندھیؒ ۱۳۴۵ھ/ ۱۹۲۶ء میں حجاز پہنچے اور ولی اللّٰہی تحریک کے مستقبل پر غور وفکر کرنا شروع کیا۔ انہوں نے شاہ ولی اللّٰہؒ کی کتب کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ولی اللّٰہی تحریک کی ناکامی کے اسباب تلاش کیے اور مستقبل میں ان ناکامیوں سے بچنے اور مؤثر حکمتِ عملی اپنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں جب وہ ۲۴ سالہ جلاوطنی کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے تو انہوں نے ولی اللّٰہی فکر کو ایک نئے انداز میں پیش کیا۔ مولانا نے اپنے مشاہدہ کی روشنی میں اس بات کا اندازہ لگالیا تھا کہ ''پان اسلامزم'' کا نظریہ خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے بعد اب ممکن نہیں رہا۔ وہ قومی تحریکات کا بڑے قریب سے مشاہدہ کر چکے تھے اور حضرت شیخ الہندؒ کی حکمت عملی کی روشنی میں یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کو اپنی آزادی کے لیے دیگر اسلامی ممالک پر انحصار کرنے کی بجائے قومی اور ملی بنیادوں پر اجتماعی جدوجہد کرنا ہوگی۔ اس حوالے سے انہوں نے ہندو، مسلم سمیت دیگر قوموں کو بھی اس جدوجہد میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ وہ انگریز سامراج کی قائم کردہ ہندو مسلم تقسیم کے مخالف تھے اور اس حوالے سے انہوں نے جمنا نربدا سندھ ساگر پارٹی اور سندھ نیشنل بورڈ قائم کیے تاکہ اس سازش کو ناکام بنایا جاسکے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''جب ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھی ہندوستان واپس تشریف لائے تو ان کی سیاست کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد اور دونوں بڑی قوموں کی مشترکہ جدوجہد پر قائم تھی۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ ملک میں فرقہ وارانہ مسئلہ پیدا کر کے تیسری قوت (انگریز) کو فائدہ اٹھانے کا کوئی ادنیٰ موقع دیا جائے۔''[۴۸]

وہ ولی اللّٰہی فکر کی روشنی میں ہندو مسلم کو سیاست میں بالخصوص اور دیگر امور میں بالعموم ایک نظریاتی اور اجتماعی وحدت کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے اور اس مسئلہ میں وحدت الوجود کی ولی اللّٰہی تعبیر سے استفادے کے حامی تھے۔ مولانا نے اپنی طویل جدوجہد اور ولی اللّٰہی جماعت کی مساعی سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مستقبل میں کوئی ایسی دینی یا لادینی تحریک کامیاب نہیں ہوگی، جو تشدد کے اصول پر کاربند ہوگی۔ چونکہ اس اصول کی بنیاد شیخ الہندؒ نے رکھی تھی اس لیے اسے ولی اللّٰہی فکر کے تیسرے دور کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے اور ولی اللّٰہی فکر سے منسوب ہر جماعت کو اس اصول پر خود کو پرکھنا ہوگا۔ اس حوالے سے مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ:

''مولانا شیخ الہند انڈین نیشنل کانگرس میں شریک ہوگئے تھے۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ عدمِ تشدد کی پالیسی سے ڈومینین اسٹیٹس حاصل کیا جائے ..... واقعہ یہ ہے کہ عدم تشدد کی پابندی کا لازمی نتیجہ صرف ڈومینین اسٹیٹس ہی ہوسکتا ہے۔''[۴۹]

مولانا اپنے عمیق مطالعہ کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے کہ ہمیں یورپین ممالک کے طرز پر اپنے نظام میں تجدیدی تبدیلی کرنا ہوگی۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ آج نہیں تو کل انگریز اس خطے سے چلا جائے گا اور مسلمان چونکہ طویل غلامی کے نتیجے میں ریاستی امور سے نابلد ہو چکے ہیں اس لیے جدید ترقیات کو ان سے سیکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ مولانا خود لکھتے ہیں کہ:

''بات یہ ہے کہ ہماری قوم پرانے اصولِ حکمت بھول چکی ہے۔ اب وہ یورپین طریقے کے نظام حکومت کو سیکھ کر کامیاب ہوسکے گی ..... بے شک روح وہی (اسلامی) رہے گی مگر حکومت کی صورت یقیناً یورپین ہوگی۔ ہمیں اس وقت ڈومینین اسٹیٹس قبول کرنا چاہیے۔''[۵۰]

یہ بات درست ہے کہ مولانا سندھیؒ کی طبیعت میں روایتی علماء کا عکس نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس وہ وسیع الذہن، وسیع القلب اور جدید خیالات کو قبول کرنے والے تھے۔ اس کا باعث ان کی جولانی طبع کے ساتھ ساتھ انقلابات زمانہ کا عینی مشاہدہ بھی تھا جو انہوں نے اپنی ۲۴ سالہ جلاوطنی کے دوران حاصل کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ ہندوستان واپس تشریف لائے تو جمعیۃ علماء ہند اور ان کے چند مخلص شاگردوں اور متعلقین کے سوا رجعت پسند مذہبی طبقے نے ان کے نظریات کی مخالفت کی۔ چنانچہ مولانا مسعود عالم ندوی نے ان پر اعتراض کیا کہ مولانا سندھیؒ اسلام اور ہندوستانی قومیت کا معجون مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ۵۱ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے مولانا سندھیؒ کے معرکۃ الاراء مقالہ (مطبوعہ الفرقان لکھنؤ) پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی کو خط میں لکھا کہ یہ مقالہ ارتدادی عقائد کے دائرے میں آتا ہے۔ ۵۲ ان کے نظریہ وحدت انسانیت اور وحدت الوجود کی غلط تعبیر کی گئی۔ ان کے نظریہ قومیت اور اس کے مقابلہ میں ''پان اسلامزم'' کے متعلق مولانا کی رائے کو مطعون ٹھہرایا گیا۔ ان کو معتزلی فکر کا شارح اور یورپ کی مادیت کا قائل کہا گیا۔ ان کے نظریہ تصوف اور مقصدیت کو آڑے ہاتھوں لیا گیا۔ اسی طرح ان پر اشتراکیت کا الزام لگایا گیا۔ اگرچہ مولانا سندھیؒ کے افکار پر تنقید کی جاسکتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے حوالے سے اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں افراط وتفریط کا بہت دخل ہے۔ اس حوالے سے اگر ان پر غیر جانبدارانہ تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو سمجھنے میں بعض لوگوں کو شدید غلطی ہوئی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی سیاسی تحریک نے برصغیر کے معروضی حالات میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا اور اس تحریک سے وابستہ علماء نے مکمل تاریخی تسلسل کے ساتھ اسے آگے منتقل کیا۔ یہ بات شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کو دیگر مسلم مفکرین سے ممتاز کرتی ہے کہ انہوں نے اپنی سیاسی فکر کی تشکیل کے لیے ایک جماعت تیار کی اور اس جماعت نے ایک طویل عرصے تک مکمل فکری تسلسل کے ساتھ ان کی سیاسی تحریک کو جاری رکھا۔ بلاشبہ یہ شاہ صاحبؒ کی جماعت کی برپا کردہ تحریک ہی تھی جس کے نتیجے میں انگریز سامراج نے اس خطے سے اپنا بوریا بستر گول کیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ہم ولی اللّٰہی جماعت کے ان اولوالعزم علماء کی جدوجہد کا حقیقی شعور حاصل کریں اور اپنی پسند ناپسند سے بالاتر ہوکر آزادی پسند علماء کی قربانیوں سے اپنے لیے راہ عمل متعین کریں۔

حواشی وحوالہ جات:

۱ سندھی، عبیداللہ، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک (سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۲۰۰۸ء) ص ۳۸۔

۲ برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، (مجلس اشاعت اسلام، لاہور، ۱۳۸۴ھ) ص ۸۶۔

۳ پھلتی، محمد عاشق، القول الجلی، (کتب خانہ انواریہ، لکھنو، ۱۹۹۰ء) ص ۸۷۔

۴ فریدی، نسیم احمد، نادر مکتوبات شاہ ولی اللہ دھلوی (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۱۰ء) ص ۶۷-۶۸۔

۵ ظہور الدین بٹ، شاہ ولی اللہ کا قافلہ (ادارہ ادب اطفال، لاہور) ص ۲۹۔

۶۔ محمد میاں، سید، علماءِ ہند کا شاندار ماضی (مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۹۱ء) ج ۲، ص ۲۹-۳۱۔

۷۔ شیخ احمد سرہندی کے بیٹوں کے نام خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد سعید، خواجہ معصوم اور خواجہ محمد یحییٰ ہیں ان میں سے خواجہ محمد صادق کا جوانی میں انتقال ہوگیا تھا بالکل اسی طرح شاہ صاحبؒ کے فرزند شاہ عبدالغنی کا بھی جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔

۸۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۵۷۔

۹۔ علماءِ ہند کا شاندار ماضی، ج ۲، ص ۴۳-۴۵۔

۱۰۔ دہلوی، شاہ عبدالعزیز، فتاویٰ عزیزی (مطبع مجتبائی، دہلی) ص ۱۷۔

۱۱۔ ثریا ڈار، شاہ عبد العزیز دھلوی اور ان کی علمی خدمات (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۹ء) ص ۱۳۰۔

۱۲۔ ندوی، ابوالحسن علی، تاریخ دعوت و عزیمت (مجلس نشریات اسلام، کراچی، س۔ن) ج ۵، ص ۳۶۸۔

۱۳۔ محمد اکرام، شیخ، رودِ کوثر (ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۹ء) ص ۵۹۱۔

۱۴۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۷۵۔

۱۵۔ اس حوالے سے مرزا حیرت دہلوی نے حیاتِ طیبہ میں تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعدازاں بعض احباب نے اسے اولین ماخذ کی حیثیت دے کر اس نظریے کی ترویج کی۔

۱۶۔ اس حوالے سے ملاحظہ ہوں علماءِ ہند کا شاندار ماضی ج ۲، ص ۲۳۶، سیرت سید احمد شھید، ج ۱، ص ۲۳، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۷۰۔

۱۷۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۹۳-۹۴۔

۱۸۔ بعض نام نہاد محققین نے اس تحریک کو تحریک طالبان افغانستان کے مماثل قرار دیا ہے۔ تاہم اس فکر کا ماخذ ہی درست نہیں ہے۔

۱۹۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۹۴-۹۵۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۹۴۔

۲۱۔ ظہور الدین بٹ، شاہ ولی اللہ کا قافلہ، ص ۶۶۔

۲۲۔ شیخ محمد تھانوی وہ بزرگ ہیں جن کے مسلک پر مولانا اشرف علی تھانوی کاربند تھے اور شیخ الہند کی جماعت کی سیاست کو غلط مانتے تھے۔

۲۳۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۰۷۔

۲۴۔ عتیق احمد (مرتب)، اٹھارہ سو ستاون: اخبار اور دستاویزیں (مجلس ترقی ادب، لاہور) ص ۱۷۵۔

۲۵۔ میرٹھی، عاشق الٰہی، تذکرۃ الرشید (مکتبہ مدنیہ، لاہور، ۱۴۰۶ھ) ج ۱، ص ۷۳۔

۲۶۔ محمود احمد ظفر، حکیم، حیات حاجی امداد اللہ مھاجر مکی (الکتاب، لاہور، ۲۰۰۶ء) ص ۱۰۰۔

۲۷۔ گیلانی، مناظر احسن، سید، سوانح قاسمی (مکتبہ رحمانیہ، لاہور) ج ۲، ص ۱۲۷۔

۲۸۔ علماءِ ہند کا شاندار ماضی، ج ۴، ص ۲۸۶۔

۲۹ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۰۸۔

۳۰ محبوب رضوی، تاریخ دار العلوم دیوبند (لاہور، ۲۰۰۵ء) ج ۱، ص ۱۶۹۔

۳۱ سہ ماہی شعور و آگہی، ج ۳، شمارہ ۳، ص ۴۸، اکتوبر-دسمبر ۲۰۱۱ء، لاہور۔

۳۲ گیلانی، مناظر احسن، سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۲۲۳۔

۳۳ مدنی، حسین احمد، نقش حیات (دار الاشاعت، کراچی، س۔ن) ج ۲، ص ۴۸۱۔

۳۴ عبد الرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان (مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ۲۰۰۱ء) ص ۱۷۵۔

۳۵ اصغر حسین، سید، حیات شیخ الهند (ادارہ اسلامیات، لاہور، ۱۹۷۷ء) ص ۲۲۔

۳۶ شاہجہان پوری، ابوسلمان، شیخ الهند مولانا محمود حسن: ایک سیاسی مطالعه (مجلس یادگار شیخ الاسلام، کراچی، ۱۹۸۸ء) ص ۳۶۔

۳۷ ایچ۔ جی۔ خان، برصغیر پاک و هند کی سیاست میں علماء کا کردار (قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء) ص ۴۴۔

۳۸ محمد ناصر، مولانا، شیخ الهند اور تحریک آزادی، (شاہ ولی اللہ میڈیا فاؤنڈیشن) ص ۱۷۔

۳۹ علماء هند کا شاندار ماضی، ج ۵، ص ۱۲۱۔

۴۰ سندھیؒ، عبید اللہ، سرگزشت کابل، مرتب: مولانا عبد اللہ لغاری (دار الکتاب، لاہور، ۱۹۹۸ء) ص ۱۱۔

۴۱ علماء هند کا شاندار ماضی (حاشیہ)، ج ۵، ص ۱۲۱۔

۴۲ محمد میاں، سید، تحریک شیخ الهند (مکتبہ رشیدیہ، کراچی، ۱۹۸۸ء) ص ۲۶۱۔

۴۳ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۴۔

۴۴ نقش حیات، ج ۲، ص ۶۷۷۔

۴۵ شیخ الهند مولانا محمود حسن: ایک سیاسی مطالعه، ص ۲۱۲۔

۴۶ ماہنامہ الرحیم، ج ۱، شمارہ ۴، ص ۳۰-۳۱، ستمبر ۱۹۶۳ء۔

۴۷ سرگزشت کابل، ص ۲۳۱-۲۳۲۔

۴۸ شاہجہان پوری، مولانا عبید اللہ سندھیؒ (حیات و خدمات) (دار الکتاب، لاہور، ۲۰۰۷ء) ص ۲۲۰-۲۲۴۔

۴۹ ایضاً، ص ۳۰۷۔

۵۰ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۴۔

۵۱ ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ)، ج ۵۵، شمارہ ۳، ص ۱۸۰۔

۵۲ ندوی، سید سلیمان، مکاتیب سلیمانی، مرتب: مسعود عالم ندوی (دار المصنفین، اعظم گڑھ) ص ۱۷۹۔